Fikr-o-Nasar (Islamabad) 5:8 (1968)

# تاریخ اسلام میں سیاسی حاکمیت کے تصوّر کا ارتقاء

ابو سلمان ضیاء

خلافتِ راشدہ کے دَور میں مسلمانوں کی سیاسی حاکمیت کا مظہر امیر المومنین یا خلیفہ ہوتا تھا، جسے صحابہ کرام میں سے سابقین اوّلین کا گروہ منتخب کرتا۔ اور وہ انھیں کے مشورے سے فرائضِ خلافت سر انجام دیتا۔ بے شک خلیفہ پابند ہوتا تھا احکامِ قرآن اور ارشاداتِ نبوی کا نیز ہر معاملے میں اسے سابقین اوّلین سے رائے لینی پڑتی تھی۔ لیکن یہ کہ اصل سیاسی حاکمیت خدا تعالیٰ کی ہے۔ اور خلیفہ اس کا صرف نائب ہے۔ یہ تصوّر ہمارے نزدیک اس شکل میں اس دَور میں موجود نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ یعنی نائب اور جانشین کا لقب دیا گیا لیکن آپ خلیفہ رسُول تھے خلیفہ اللہ نہ تھے اور نہ اس زمانے میں خلافت کے معنی خلافت اللہ کے لئے جاتے تھے۔ یہ معنی بہت بعد عباسیوں کے دَور میں رواج پذیر ہوئے۔ حضرت ابو بکرؓ کے بعد جب حضرت عمرؓ کو "خلیفہ رسول کے خلیفہ" کا لقب قدرے طویل محسوس ہوا تو انھوں نے اپنے لئے جو لقب اختیار کیا۔ اس سے ان بزرگوں کے رجحانِ فکر کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے "خلیفہ خلیفہ رسول" کے بجائے امیر المومنین کہلوانا پسند فرمایا۔ یعنی مومنین اور مسلمانوں کے امیر۔ اس لقب سے اللہ کی سیاسی حاکمیت کی جانشینی کے بجائے مسلمانوں کی سیاسی حاکمیت اور ان کی نمائندگی کا خیال غالب ہے [1]

---

[1] حضرت عمرؓ سے ایک واقعہ مروی ہے کہ آپ نے کسی صاحب سے کوئی بات پوچھی۔ اس نے جواب میں اللہ اعلم بالصواب (اللہ بہتر جانتا ہے) کہا۔ حضرت عمرؓ نے قدرے جھلّا کر فرمایا کہ یہ تو میں جانتا تھا کہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ میرا سوال تو تم سے تھا کہ تم اس چیز کے بارے میں کچھ جانتے ہو یا نہیں

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

باقی رہا اس دور میں نظام سلطنت اور نظم و نسق حکومت کا معاملہ تو جیسا کہ "مسلمانوں کا نظمِ مملکت" کے دو مصری مصنفوں ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن اور علی ابراہیم حسن نے لکھا ہے کہ قرآن نے کوئی ایسا دستورِ حکومت متعین نہیں کیا تھا۔ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمان عمل کرتے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض آیات میں نظم حکومت کے بارے میں اجمالی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ کار آپس میں مشورہ کرنا ہے۔ ایک اور موقع پر رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوتا ہے کہ آپؐ صحابہ سے مشورہ کیا کریں۔ لیکن یہ کہ خلیفہ کیسے منتخب ہو! اسے کون منتخب کریں۔ خلیفہ کے کیا حقوق و واجبات ہیں۔ وہ ایک مدّتِ معینہ کے لئے ہو یا تا حینِ حیات۔ اسے برطرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اور اگر خلیفہ برطرف کیا جا سکتا ہے تو اسے برطرف کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔ ان امور کے متعلق قرآن میں مطلقاً کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اور نہ احادیث میں ان امور کی صراحت کی گئی ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا۔ تو آپؐ کی جانشینی کے بارے میں صحابہ کرام میں اختلاف رونما ہوا اور وہ اس لئے جیسا کہ "مسلمانوں کا نظمِ مملکت" کے مصنفوں نے لکھا ہے۔

"آنحضرتؐ نے اس کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا"۔

اور پھر حضرت ابوبکرؓ کا جس طرح انتخاب ہوا، حضرت عمرؓ کا اس طرح انتخاب نہیں ہوا، اور جیسے حضرت عمرؓ چنے گئے، ویسے حضرت عثمانؓ نہیں چنے گئے اور نہ حضرت علیؓ اس طرح خلیفہ منتخب ہوئے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ نظمِ مملکت کی یہ تمام تفصیلات جمہور مسلمانوں پر چھوڑی گئی تھیں۔ قرآن اور حدیث میں ان کی وضاحت نہیں کی گئی۔

بے شک خلافت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ "امیر قریش سے ہوں" لیکن ابنِ خلدون جیسے محقق نے اس کی بھی تاویل کی ہے۔ اس کے نزدیک چونکہ خلافت کے لئے اس وقت قبیلۂ قریش زیادہ موزوں تھا۔ اس لئے آپؐ نے یہ فرمایا کیونکہ بقول اس کے

"ہر شرعی حکم کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ کسی خاص مقصد پر مبنی ہو۔ ہم جب خلافت کے لئے قریشی النسب ہونے کی شرط پر بحث کرتے ہیں تو ہمارا دائرۂ بحث سطح بین طبقے کی طرح آنحضرت سے شرفِ تعلق تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ہم بہ نظرِ عمیق دیکھیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ قریش عصبیت کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ اور ان میں مرکزیت قائم کرنے کی صلاحیت

تھی۔ اور وہ اتنی طاقت رکھتے تھے کہ ظالم سے مظلوم کا حق دلا سکیں۔ جزیرہ عرب کے باشندے اس حقیقت سے واقف تھے اور اسی لئے قریش سے دبتے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ یہ تھے وہ حالات جن کی بنا پر آپؐ نے امامت کے لئے قریش ہونے کی شرط لگائی تھی۔ کیونکہ آپؐ کی دُور بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ جزیرہ عرب میں اگر کوئی خاندان مرکزیت پیدا کر سکتا ہے تو وہ قریش کا خاندان ہے"۔

ابن خلدون کے اس استدلال سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جہاں تک نظمِ مملکت کا تعلق ہے، اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی چیز مروی ہے تو اسے اس خاص مقصد کے پیشِ نظر دیکھنا چاہیئے۔ جو اس وقت آپؐ کے سامنے تھا۔ جیسا کہ آپؐ کا یہ ارشاد کہ امیر قریش سے ہوں، ایک مصلحت کے تابع تھا، جو اُن حالات اور اس زمانے کے لئے مخصوص تھی۔

اس کے بعد خلافتِ راشدہ میں جو دفتری نظام قائم ہوا، اس کا ذکر آتا ہے۔ اس ضمن میں کتاب مذکور کے مصنفین لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ایک ایرانی مدبّر کے مشورے سے دفتری نظام قائم کیا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ بقول ان کے، مثال کے طور پر:۔

"مسلمانوں سے قبل روم و فارس کی حکومتوں میں ٹیکس کا محکمہ قائم تھا۔ ہر صوبے میں ایک افسر کے ماتحت بہت بڑا عملہ کام کرتا تھا۔ اس افسر کو ضروری مصارف کا اختیار حاصل تھا۔ لیکن اس کا فرض تھا کہ آمد و خرچ میں توازن کا خیال رکھے"

چنانچہ جب مسلمانوں نے ان ملکوں کو فتح کیا تو انھوں نے ان محکموں کو باقی رکھا۔

آپ کو سُن کر شائد تعجب ہو کہ نظمِ مملکت کے سلسلے میں جن چیزوں کو آج بعض حلقوں میں اسلامی نظامِ حکومت کے لوازم بتایا جاتا ہے، ان میں سے بیشتر چیزیں دورِ خلافتِ راشدہ اور بعد میں روم و فارس سے اخذ کی گئیں۔ یہاں تک کہ خود جزیہ تک مسلمانوں کی اپنی ایجاد نہیں۔ بلکہ خود یہ لفظ عربی نہیں۔ جزیہ کو سب سے پہلے یونانیوں نے ایشیائے کوچک کے باشندوں پر ۵۰۰ ق م میں عائد کیا۔ بعد میں ایرانیوں اور رومیوں نے ان کی تقلید کی۔ اور اپنی مفتوحہ قوموں پر اسے لازمی قرار دیا۔ مسلمان آئے تو انھوں نے بھی اپنی غیر مسلم رعایا کے لئے جزیہ کے ٹیکس کو ضروری رکھا۔ البتہ اس میں مناسب اصلاحات کیں۔ مختصراً جیسا کہ اس کتاب کے مصنّفوں نے لکھا ہے۔

"اسلامی ریاست کا شہری نظام روم و فارس سے قریباً ماخوذ ہے۔ عربوں کو علم تھا، کہ ان

قوموں کا سیاسی نظام، ان کی تہذیب اور ان کا تمدن، تاریخ میں امتیازی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ عربوں نے بلادِ روم و فارس کو فتح کرنے کے بعد ان کے صدیوں کے نظامِ شہری کو درہم برہم کرنا مناسب خیال نہ کیا اور چند خلافِ اسلام امور میں اصلاحات کے سوا اور کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔"

مولانا شبلیؒ نے الفاروق میں بڑی تفصیل سے نظمِ حکومت کے وہ شعبے گنائے ہیں جو حضرت عمر فاروقؓ نے ایران و روم سے اپنے ہاں منتقل کئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ وہ قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے قواعد و انتظامات واقفیت پیدا کرتے تھے۔ اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں، ان کو اختیار کرتے تھے۔ خراج، عشور، دفتر، رسد، کاغذاتِ حساب ان تمام انتظامات میں انھوں نے ایران و شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا۔ البتہ جہاں کوئی نقص پایا، اس کی اصلاح کر دی۔ .... جزیہ، حالانکہ بظاہر مذہبی لگاؤ رکھتا تھا۔ تاہم اس کی تشخیص میں وہی اصول ملحوظ رکھے جو نوشیرواں نے اپنی حکومت میں قائم کئے تھے۔ علامہ طبری نے جہاں نوشیرواں کے انتظامات اور بالخصوص جزیہ کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھا ہے کہ یہ وہی قاعدے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے فارس کا ملک فتح کیا تو ان کی اقتدا کی۔"

اس پر مولانا شبلیؒ مزید اضافہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس سے زیادہ صاف اور مصرح علامہ ابن مسکویہ نے اس مضمون کو لکھا ہے ـــــ عمرؓ فارس کے چند آدمیوں کو صحبتِ خاص میں رکھتے تھے۔ یہ لوگ ان کو بادشاہوں کے آئینِ حکومت پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ خصوصاً شاہانِ عجم اور ان میں بھی خاص کر نوشیرواں کے، اس لئے کہ ان کو نوشیرواں کے آئین بہت پسند تھے اور وہ ان کی بہت پیروی کرتے تھے ـــــ علامہ موصوف کے بیان کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ عموماً مورخوں نے لکھا ہے کہ جب فارس کا رئیس ہرمزان اسلام لایا تو حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے خاص درباریوں میں داخل کیا اور انتظامات کے متعلق اس سے اکثر مشورہ لیتے تھے۔"

اور اس سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد بنو امیّہ اور بنو عباس کے دَور

ہیں مسلمانوں کے ہاں حکومت کے جتنے بھی شعبے قائم ہوئے ان کی بنیاد خلافتِ راشدہ کے اس عہدِ فاروقی میں رکھی گئی تھی اور جیساکہ مولانا شبلیؔ نے لکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے نہ صرف ایک وسیع مملکت قائم کی بلکہ اس میں ہر قسم کے ملکی انتظامات مثلاً تقسیم صوبجات و اضلاع، انتظام محاصل صیغۂ عدالت، فوجداری اور پولیس، پبلک ورکس، تعلیمات۔ صیغۂ فوج کو ترقی دی۔ اور ان کے اصول اور ضابطے مقرر کئے۔ اور ان ملکی انتظامات کے قیام میں حضرت عمرؓ نے ایران و روم کے ہاں رائج شدہ نظام مملکت سے کتنا استفادہ کیا وہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔

خلافتِ راشدہ کے بعد دورِ اموی میں نظم و نسق حکومت کا تقریباً یہی نقشہ رہا۔ سوائے اس بنیادی اور اہم فرق کے کہ اموی امیر المومنین یا خلیفہ تابع ہوتا تھا اپنے خاندان اور قبیلے کے سرداروں کا، اور اس کے عزل و نصب میں زیادہ تر انہی کی بات مانی جاتی تھی۔ عہدِ اموی میں خلیفہ کی حیثیت اغلباً ایک سیاسی حاکم کی تھی جس کی پشت پناہی پر اس کا قبیلہ اور اس کی قوم ہوتی تھی۔ امویوں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے امارت و ریاست کے مذہبی تصوّرات اور مذہبی طبقوں سے کام لینا کبھی ضروری نہ سمجھا۔ ان کے زمانے میں مسلمانوں کے علمی و مذہبی مرکز بدستور مدینہ اور مکہؔ رہے۔ اور اموی پایۂ تخت دمشق صرف سیاسی مرکز تھا۔ اور انھوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہ کی۔ کہ اپنی سیاسی قوت کو مذہبی رنگ دے کر اسے بحیثیت ایک مذہبی نظام کے مسلمانوں سے منوائیں۔ اور نہ انھوں نے مذہب کو اپنی سیاست کا تابع اور مذہبی طبقوں کو اپنا آلۂ کار بنانا چاہا۔ ان کی خلافت سیدھا سادا ایک سیاسی نظام تھا اور بس

اموی خلافت کے بعد جب بنو عباسؔ برسرِ اقتدار آئے تو عباسی خلافت کے حقیقی بانی منصور نے جو ان کا دوسرا فرمانروا تھا، عباسی خلیفہ کو اپنے اموی پیش روؤں کی طرح مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مظہر منوانے پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ اسے ایک مستقل دینی حیثیت بھی دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس طرح عباسی خلافت بنو امیہؔ کی خلافت کی طرح محض ایک سیاسی منصب نہ رہا کہ اگر سیاسی اقتدار چھن جائے تو اس کے ساتھ عباسیوں کی خلافت بھی نہ رہے بلکہ منصور اور اس کے بعد آنے والے عباسی خلفاء کی کوششوں سے وہ سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ دینی اقتدار کی بھی مظہر قرار دی گئی۔ اور عام مسلمان خلافت کو ملیؔ زندگی کی ایک اہم اساس کی حیثیت سے ماننے لگے۔ اور آگے چل کر سُنی مسلمانوں کا یہ عقیدہ سا ہو گیا کہ

خلافت کے بغیر مسلمانوں کی ملّی زندگی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اور خلافت منجملہ ارکانِ مذہب کے سمجھی جانے لگی۔

منصور کی یہ سیاسی جدّت یا اختراع[1] اس زمانے کے حالات اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے ناموزوں نہ تھی۔ اس سے نہ صرف عباسی خلافت کے ادارہ کو استحکام ملا۔ بلکہ اس کی وجہ سے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے میں ایک تصوّراتی وحدت اور ایک تاریخی تسلسل وجود میں آیا۔ جس سے آگے چل کر یہ فائدہ پہنچا کہ خلیفہ المامون کے بعد جب عباسی خلافت کی سیاسی حیثیت کمزور ہو گئی اور نہ صرف سلطنت کے مختلف حصوّں میں بلکہ خاص بغداد تک میں اس کا سیاسی اقتدار برائے نام رہ گیا۔ تو پھر بھی بحیثیت ایک دینی ادارہ اور مذہبی اقتدار کے مظہر کے، اس کا سکّہ چلتا رہا۔ اس دوران میں بڑے بڑے جابر اور فاتح فرمانروا برسر اقتدار آئے۔ لیکن ان کو بھی عباسی خلیفہ کی قانوناً فرمانبرداری کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی حکومت قانونی طور پر ناجائز سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ اس طرح تقریباً پانچ سو سال تک بغداد کی عبّاسی خلافت تمام سُنی دنیا کی اطاعت و عقیدت کا مرکز بنی رہی اور دُور دراز ملکوں کے مسلمان فرمانروا عباسی خلفاء کی جاری کردہ سندوں کو اپنی حکومت کے لئے قانونی جواز سمجھتے اور ان کے عطا کردہ القاب کو بڑے فخر سے اپنے ناموں کے ساتھ لکھتے۔ مسلمان عوام کی نظروں میں اس طویل عرصے میں عباسی خلافت نے اس قدر مذہبی احترام و عقیدت حاصل کر لی تھی کہ جب ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے بغداد کو تاراج کیا۔ اور عبّاسی خلیفہ کو قتل کر دیا تو تمام سنّی دنیا میں کہرام مچ گیا اور مسلمان بجا طور پر سمجھے کہ بس قیامت قریب آ گئی۔ کیونکہ یہ ان کا عقیدہ سا بن گیا تھا کہ خلیفہ کے بغیر دنیا کا نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ اور شائد یہی وجہ تھی کہ مصر کے ممالیک نے بغداد کی تباہی کے بعد ایک عباسی شہزادہ کو خلیفہ بنا لیا اور وہ اس سے اپنی حکومت کے لئے قانونی جواز کی سند لینے لگے۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین تک مصر کے ان عباسی خلفاء سے عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ چنانچہ مصر کی اس عباسی خلافت کا سلسلہ تقریباً ۲۶۰ سال تک چلتا رہا۔

---

[1] منصبِ خلافت کو یہ شکل دینے میں ممکن ہے منصور کو ایرانی شہنشاہیت کی قدیم روایتوں سے بڑی مدد ملی ہو۔ عباسی خلافت کے قیام اور اس کو چلانے میں ایرانیوں کا جتنا ہاتھ تھا۔ وہ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ عباسی خلافت دراصل عباسیوں کی امارت اور ایرانیوں کی وزارت کا نام تھا۔ اور شائد اس کی ایک وجہ آلِ علیؑ کی امامت اور سیادت کا توڑ کرنا ہو۔

اب ہوا یہ کہ المامون تک تو دنیائے اسلام کے غالب حصے میں عباسی خلافت سیاسی اور دینی دونوں حیثیتوں سے اقتدار کی مالک تسلیم کی جاتی رہی۔ اس کے بعد جب عباسی خلفاء سیاسی لحاظ سے کمزور ہو گئے اور سلطنت کے مختلف حصّوں میں آزاد اور خود مختار مسلمان فرمانروا برسر اقتدار آ گئے اور خود بغداد میں عباسی خلیفہ قریب قریب ترکی سرداروں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ تو خلافتِ عباسی کی سیاسی حیثیت پر کم اور اس کی مذہبی حیثیت پر زور دیا جانے لگا۔ اور یہ بات فطری بھی تھی۔ چنانچہ اس طرح دنیائے اسلام میں مسلمان فرمانرواں کی سیاسی اور دنیاوی حاکمیت کے مقابلے میں اسلام کی دینی وقانونی حاکمیت کا تصوّر پیدا ہوا۔ جس کی اس وقت عباسی خلافت عملی مظہر تھی۔ اور اس زمانے میں اسے مرکزیتِ اسلام کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ تصوّر بتدریج ترقی کرتا گیا[۱] اور زمانے کے ساتھ ساتھ اس تصوّر کے عملی مظاہر بھی بدلتے گئے۔ یہاں تک کہ آخر میں علمائے دین، اسلام کی اس دینی وقانونی حاکمیت کے شارح اور مدار علیہ قرار پائے۔ اور بادشاہوں اور سلاطین کے عزل ونصب کے لئے ان سے قانونی اجازت لینا ضروری ہو گیا۔ اور وہ اس لئے کہ اگر مسلمان فرمانروا اسلام کے سیاسی اقتدار کا مظہر تھے۔ تو اسلام کے دینی وقانونی اقتدار کا مرجع علماء تھے۔ اور ظاہر ہے۔ اس عہد میں آخر الذکر کو ہر حال میں اوّل الذکر پر فوقیت حاصل تھی۔

---

[۱] ممکن ہے اس تصور کی ترویج کو اس بات سے خاص مدد ملی ہو کہ اس زمانے میں عباسیوں کے حریف شیعانِ علیؓ اسماعیلی اور اثنا عشری دونوں، اپنے اماموں کو نہایت ہی محترم اور بلند پایئے کے دینی منصب پر فائز کرتے تھے اور عباسی خلافت کے خلاف ان کا تمام تر پروپیگنڈا اماموں کے اس دینی منصب کے نام سے تھا۔ اس ضمن میں عباسی خلافت کے ہر حصے میں اسماعیلی داعی اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔ اور ان کی ساری جدوجہد مخصوص عقائد وتصوّرات کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اسماعیلی اپنے "امام حاضر" کو نہ صرف رسول اللہ کی نبوت کا ترجمان، بلکہ اللہ تعالیٰ کی سیاسی وقانونی حاکمیت کا مظہر ثابت کرتے تھے اور اسے قانون سازی کا مکمل حق دیتے تھے۔ اس زمانے میں اس قسم کے "شخصی امام" کی طرف دعوت بڑی مؤثر اور فعّال تھی۔ اس فضا میں عباسی خلافت کو ایک دینی منصب کا درجہ دینا اور اسماعیلیوں کے "امام حاضر" کے مقابلے میں عباسی خلیفہ کی دینی حیثیت پر زور دینا بالکل فطری تھا۔ اسماعیلی دعوت نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ دینی، اعتقادی، تصوّراتی اور ذہنی لحاظ سے بھی سُنّی دنیائے اسلام کے لئے صدیوں تک بہت بڑا خطرہ رہی۔ اور سُنّی فکر کو اس کے مقابلے کے لئے ہر طرح سے لیس ہونا پڑا۔

چنانچہ ہندوستان میں اکبر اعظم کا سیاسی حاکمیت کے ساتھ ساتھ ملاّ مبارک اور اس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کے مشورے سے دینی اور قانونی حاکمیت میں بھی آخری سند بننے کی کوشش کرنا دراصل علماء کے اس تاریخی و روایتی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے تھا جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

ہمارے نزدیک اسلام کی دینی و قانونی حاکمیت کا یہ تصوّر اس زمانے اور اس ماحول میں بڑا مفید ثابت ہوا۔ اور ان حالات میں یہ تصوّر صحت مند بھی تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمان ملکوں کے حکمران جو اکثر اکھڑ اور منہ زور ہوتے تھے، اور وہ علم و حکمت اور تربیت و ثقافت سے بھی کم ہی بہرہ مند تھے، اس رائج الوقت تصوّر اور عقیدے کی وجہ سے شریعت کے ضابطوں کے پابند رہنے پر مجبور ہو جاتے تھے، اور ان میں سے بہت کم شرعِ اسلام کی خلاف ورزی کی جراءت کرتے تھے۔ اس تصوّر کا تار و پود یوں بُنا گیا کہ سب سے پہلے سیاسی حاکمیت کے مقابلے میں شریعت کی حاکمیت کی برتری کا اصول وضع ہوا۔ شریعت خدا اور اس کے رسولؐ کی منظہر تھی۔ اور اس کی پابندی ہر مسلمان کے لئے لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اور چونکہ شریعت کے شارح اور ترجمان علمائے کرام تھے۔ اس لئے ایک مسلمان ملک میں دینی و قانونی اقتدار کا سرچشمہ بھی علمائے کرام سمجھے جاتے تھے اور فرمانروا مجبور تھے کہ شرع و قانون میں علماء سے مشورہ لیں اور ان کے خلاف نہ جائیں، ورنہ مسلمان عوام کو مطمئن رکھنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔ اور سلطنت کا کوئی دوسرا دعویدار اس قسم کے مخالف شرع بادشاہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتا تھا۔ اور علماء کے ساتھ ساتھ عوام بھی اس کا ساتھ دیتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں مطلق العنان بادشاہوں پر یہ ایک بہت بڑی روک تھی۔ اور ترکی کے سلطان سلیم جیسے جابر، سرکش اور خونخوار فرمانروا بھی مجبور ہو جاتے تھے کہ شریعت کے حکم کی خلاف ورزی نہ کریں۔ اور شیخ الاسلام کے فتوے کے سامنے سر جھکا دیں [1]

الغرض آپ نے دیکھا کہ جہاں تک اس دَور میں اس تصوّر کی افادیت اور صحت مندی کا سوال ہے، اس میں کوئی کلام نہیں۔ اس میں "خیر" کا پہلو نسبتاً بہت غالب اور "شر" کا پہلو بہت کم تھا۔ اس

---

[1] سلطان سلیم چاہتے تھے کہ اپنی سلطنت کی عیسائی رعایا کو مجبور کریں کہ یا تو وہ مسلمان ہو جائے یا قتل ہونا قبول کرے۔ شیخ الاسلام نے سلطان کے اس ارادے کو خلافِ شرع بتایا اور اسے اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دیا جسے سلطان کو مجبوراً ماننا پڑے۔

سے ایک تو مطلق العنان فرمانروا قابو میں رہتے تھے. کیونکہ ان کا سیاسی اقتدار قانوناً اور اصولاً تابع سمجھا جاتا تھا شریعت کے اقتدار کا. جس کے واضح اور مدون اصول تھے اور یہ اصول انسانیت کے صحیح تقاضوں اور فرد و جماعت کی اخلاقی ضرورتوں پر مبنی تھے۔ اس طرح سرکش حکمران بھی بے عنان نہ ہونے پاتے اور عوام کی داد رسی بھی حتی الوسع ہوتی رہتی۔ دوسرے اس تصوّر کی وجہ سے سُنّی مسلمانوں کی تاریخی و فکری وحدت صدیوں تک قائم رہی اور وہ اپنے آپ کو ایک "دارالاسلام" کے باشندے سمجھتے رہے.

لیکن آگے چل کر ہوا یہ کہ دو سو سال کی مسلسل صلیبی جنگوں نے جو ۱۰۹۷ء میں شروع ہوئی تھیں اور ان کے بعد تاتاریوں کے حملوں نے جن کے ہاتھوں وسط ایشیا، عراق و شام اور بالخصوص بغداد کے اسلامی مرکز بالکل تباہ و برباد ہو گئے تھے، دنیائے اسلام کو ذہنی اور تہذیبی لحاظ سے بالکل بے جان کر دیا اور مسلمانوں کی فکری توانائی مضمحل ہو کر رہ گئی۔ اس کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا. اور اس میں برابر جمود آتا چلا گیا[1] ان حالات کا اس تصوّر اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج پر رد عمل ہونا طبعی تھا. چنانچہ قوم کے دوسرے طبقوں کی طرح علماء بھی جمود کا شکار ہوئے اور چونکہ ان کی حیثیت مسلمانوں کے دماغ کی تھی۔ اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا تھا. اور پھر اس وقت مسلم معاشرے میں قانون ہمہ گیر حیثیت اختیار کر چکا تھا. اس لئے جب علماء جمود میں مبتلا ہوئے اور انھوں نے زمانے کے ساتھ آگے قدم بڑھانے سے انکار کر دیا تو پورا مسلم معاشرہ اس جمود میں جکڑا گیا. چنانچہ جہاں دوسری دنیا آگے بڑھ گئی مسلمان پیچھے رہ گئے اور اس کے بعد برابر وہ پیچھے ہی رہنے پر مصر رہے اور اس طرح ایک جمود دوسرے جمود کو وجود میں لانے کا باعث بنا اور پھر پوری قوم اس میں بُری طرح گرفتار ہو گئی.

---

[1] صلیبی حملوں اور تاتاریوں کی فوج کشیوں میں مسلمانوں کا جو مالی نقصان ہوا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا. لیکن اس کے ساتھ جو علمی اور تہذیبی تباہ کاریاں ہوئیں ان کے صدمے سے مسلمان آج تک نہیں سنبھل سکے صلیبی جب شام و فلسطین کے ساحلی علاقوں میں پہنچے تو یہ علاقے کتب خانوں. مدرسوں اور تہذیبی اداروں کے مرکز تھے. اسی طرح تاتاریوں نے جب وسط ایشیا کے شہروں، ہرات. سمرقند. رے. بلخ اور خجند کو تباہ کیا تو نہ صرف یہ کہ ان میں سے ایک ایک آبادی لاکھوں تک پہنچتی تھی. بلکہ یہ شہر تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے مراکز تھے اور اگرچہ اب اس سانحہ پر صدیاں گزر گئیں لیکن یہاں کے مسلمان زوال سے نہیں نکلے

مسلمان عوام تاریخ کے پیہم صدمات سے نڈھال ہو چکے تھے اور صلیبیوں اور تاتاریوں کی تباہ کاریوں نے انھیں تہذیبی و تمدنی روایات اور فکری و علمی سرچشموں سے محروم کر دیا تھا۔ اس زمانے میں جو حکمران ہوئے ان میں اکثریت اجڈ اور کندہ ناتراش لوگوں کی تھی اور علماء تو جمود کا شکار ہو ہی چکے تھے۔ اب عوام میں توانائی جسمانی اور ذہنی توانائی نہیں تھی کہ از خود اس جمود کو توڑ کر قدم آگے بڑھا سکتے۔ حکمران اپنے تاج و تخت میں مگن تھے اور اپنی بے زبان اور بے شعور رعایا پر ستم ڈھا کر جی خوش کر لیتے تھے اور نہ عوام میں سے اور نہ علماء میں سے کوئی ان کا ہاتھ روکنے کی جراءت کر سکتا تھا۔ علماء کا کام بادشاہوں اور عوام دونوں کو مطمئن رکھنا رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے عوام تو کسی شمار و قطار میں تھے ہی نہیں۔ لیکن اگر بادشاہوں میں سے کوئی اس جمود کو توڑنے کی ہمت کرتا تو علماء اس کے آڑے آجاتے۔ اور عوام کو اس کے خلاف بھڑکا دیا جاتا۔ اور اگر کوئی عالم نیا فکر دیتا یا نیا اجتہاد کرتا تو اسے بدعتی و بدعقیدہ بتا کر مصائب کا نشانہ بنایا جاتا۔ جاہل عوام جمود کے حامی اور ہر نئی چیز کے دشمن تھے۔ حکمرانوں کا مفاد یہ تھا کہ عوام کو اس جمود میں غرق رکھیں اور علماء بالعموم دونوں کو دنیا اور آخرت کی فلاح کا یقین دلایا کرتے۔ چنانچہ اس ہمہ گیر اور جامع جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی اور مسلمانوں کے تمام طبقوں اور بالخصوص علماء کو ایک ہی مقام پر جمے رہنے کی ضد ہو گئی۔

علماء کا اصرار تھا کہ فرمانروا شرع کے پابند رہیں۔ اور شرع میں اجتہاد کا دروازہ صدیوں سے بند کیا جا چکا تھا۔ شرع کی تعبیر و تشریح اجماع کے تابع تھی اور اجماع ظاہر ہے اس وقت قدامت پرستی اور جمود کا دوسرا نام تھا۔ عوام پر زیادہ تر علماء کا اثر تھا اور اسلام کے نام سے ان کو کسی کے خلاف اٹھانا چنداں مشکل نہ تھا۔ بے شک کبھی کبھار ایک آدھ بادشاہ علماء سے ٹکر بھی لے لیتا تھا لیکن اسے علماء کے مقابلے میں اکثر منہ کی کھانی پڑتی تھی اور وہ اس لئے کہ علماء شریعت کے محافظ تھے اور مسلمانوں کے ہاں کئی سو سال سے شریعت سیاسی اقتدار پر غالب تسلیم کی جاتی تھی اور مسلمانوں کا یہ ایک مذہبی عقیدہ بن گیا تھا۔ آخر میں علماء کے جمود کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ ترکی میں انھوں نے باوردی فوجی ڈرل تک کو حرام قرار دے دیا۔ اور ان کے نزدیک نئے علوم کا حاصل کرنا بمنزلہ کفر تھا۔

اسی زمانے میں سیاسی حکمرانوں کے اقتدار کے مقابلے میں شریعت کے اقتدار کی برتری پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ اور اس سلسلے میں ان تصورات کا فروغ ہوا۔ خدا کی اس سیاسی و قانونی

حاکمیت کے یہ تصوّرات ہمیں مسلمانوں سے کہیں زیادہ واضح اور فعّال شکل میں ان یورپی مفکرّوں کے ہاں ملتے ہیں جو قرون وسطیٰ میں ہوئے اور جن کے پیش نظر یورپ کی متحدہ مسیحی سلطنت کو جو اصولاً مسیحی مذہب کے ہمہ گیر سیاسی وقانونی اقتدارِ اعلیٰ کے اساس پر قائم تھی، بچانا تھا۔ اور عملاً وہ حکومت عبارت تھی پوپ اعظم اور اس کے ماتحت پادریوں کے اقتدار سے یورپ کی اس متحدہ مسیحی حکومت پر اس وقت زد پڑ رہی تھی یورپ میں قومی بنیادوں پر قائم ہونے والی نئی حکومتوں کی قرون وسطیٰ کے ان مسیحی مفکروں نے اپنے نظریات میں بادشاہوں کے حقِ حکمرانی کے مقابلے میں خدا کے حق حکمرانی کو پیش کیا۔ جس کی ترجمانی اس زمانے میں ظاہر ہے پوپ اور اس کے ماتحت پادری کرتے تھے۔ ان تصورات میں بڑی سختی سے علاقائی قومیت کی نفی کی گئی۔ کیونکہ پوپ کے عالم گیر اقتدار کے خلاف سب سے زیادہ قومی رجحانات ہی کام کر رہے تھے۔ اور اس وقت دراصل وہاں مسیحی کلیسا اور قومیت کی براہِ راست لڑائی تھی۔

یہ عیسائی مفکر سب سے زیادہ زور خدا کی حاکمیت پر دیتے تھے اور صرف مذہبی عقائد کے معاملات میں نہیں بلکہ اس کی سیاسی وقانونی حاکمیت پر ان کا زیادہ زور تھا۔ خدا کو سیاسی وقانونی حاکم منوا کر ایک تو وہ آسانی سے قومی حکمرانوں کی سیاسی حاکمیت کے دعووں کی تردید کر سکتے تھے۔ کیوں کہ یہ حکمران زیادہ تر اپنی رعایا کے قومی جذبات سے اپیل کرتے تھے اور اس کے برعکس پوپ کی اپیل مذہب کی تھی۔ اور وہ مسیحی عقائد، مسیحی اخلاق اور مسیحی قوانین کی حفاظت اور نفاذ کا مدعی تھا۔ جس کے لئے اصولاً اور عملاً ایک مسیحی حکومت کی ضرورت تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ کش مکش کئی سو سال تک جاری رہی، اور اس دوران میں مسیحی عقائد، مسیحی اخلاق اور مسیحی قوانین کی حفاظت کے لئے الحاد و گمراہی کا الزام لگا کر یورپ میں لوگوں کو جس طرح قتل کیا گیا، اذیتیں دی گئیں اور ان کو جلایا گیا۔ اس کی ایک طویل داستان ہے۔

اس کش مکش میں عیسائیوں کے ایک مذہبی گروہ نے دوسرے مذہبی گروہ پر جو لرزہ خیز مظالم توڑے اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ چنداں خلاف توقع نہ تھے، کیونکہ جب آپ نے یہ مانا کہ ایک ملک میں اصل حاکمیت خدا کی ہے۔ اور وہ حاکمیت سیاسی وقانونی دونوں ہے اور حکومت صرف خدا کی اس سیاسی وقانونی حاکمیت کو بروئے کار لانے کا ایک ذریعہ ہے اور بس، تو اس صورت میں ایسی حکومت

کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے دین کی حفاظت کرے اور اس کے اوامر و نواہی کی لوگوں سے پابندی کرائے، ترغیب سے اور اگر ضرورت ہو تو زبردستی بھی۔ اور اگر کوئی شخص خدا کے دین کی مخالفت کرتا ہے۔ اور اس کے مقرر کردہ احکام و قوانین کو ماننے کے لئے تیار نہیں، تو ایسی حکومت کو اصولاً حق پہنچتا ہے کہ وہ اس شخص کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کرے۔ اب رہا یہ سوال کہ خدا کی سیاسی و قانونی حاکمیت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ تو ظاہر ہے عیسائیوں کے ہر فرقے کے لوگ اپنے عقیدے کے مطابق اسے سمجھیں گے اور اس میں یہ سب انتہائی مخلص ہوں گے اور پورے خلوص نیت سے اس کو خدا کی سیاسی و قانونی حاکمیت کی شکل مانیں گے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جب قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے کیتھولک عیسائی پروٹسٹنٹ عقیدے والوں کو زندہ جلاتے تھے اور جب پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو موقع ملتا تھا تو وہ کیتھولک فرقے والوں کو جلاتے اور اذیتیں دیتے تھے۔ تو ان میں سے اکثر خلوص دل سے ایسا کرتے تھے اور وہ یہ سمجھ کر ایسا کرتے تھے کہ اس طرح ہم ان خطاکاروں کی روحوں کو الحاد و گمراہی کی آلائش سے پاک کر رہے ہیں۔ اور یہ ایک کارِ خیر ہے اور اس میں خدا کے دین کی نصرت ہے۔ اپنی ذاتی کوئی غرض نہیں۔

بہرحال یورپ میں اس دَور کو گزرے کئی صدیاں ہوگئیں۔ اور اس کے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے یورپی مفکرّوں کے یہ تصوّرات بھی کبھی کے ختم ہوگئے۔ اور یورپ والوں نے اس شکل میں خدا کی سیاسی و قانونی حاکمیت کو نظامِ حکومت کا اساس بنانے کا خیال ترک کر دیا۔

خدا کی "سیاسی و قانونی حاکمیت" کے اساس پر" پوری زندگی کی جامع اسکیم کو بروئے کار لانے کی کوشش کا یورپ میں جو حشر ہوا۔ وہ آپ نے دیکھ لیا۔ چنانچہ سب سے پہلے وہاں مذہبی جنگیں ہوئیں۔ جنہوں نے قومیت کے جذبے کو پیدا کیا۔ قومیت کی یہ تحریک دراصل بغاوت تھی۔ یورپ کے عوام کی صدیوں کے قائم شدہ کلیسا اور پوپ کے اقتدار کے خلاف، جو خدا کی سیاسی و قانونی حاکمیت کے مدعی اور اس کے نتیجے میں قومیت کی حاکمیت اور جمہور کی حکمرانی کے مخالف تھے۔ اس کے بعد یہ عوام غیر ملکی جابر حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس طرح یورپ میں اٹھارھویں صدی کے بعد سے برابر آزاد قومی ریاستیں وجود میں آتی گئیں جو بعد میں بتدریج جمہوری بنتی گئیں۔ اور انھوں نے یا تو اپنے ہاں کے مطلق العنان بادشاہوں کا صفایا کر دیا یا انھیں عوام کی مرضی کا پابند اور قومی پارلیمنٹوں کا تابع بنا دیا۔ ان قومی ریاستوں کو محض قانونی و دستوری لحاظ سے نہیں بلکہ سماجی و اقتصادی اعتبار

سے بھی صحیح معنوں میں جمہوری بنانے کا یہ عمل یورپ میں اب بھی جاری ہے۔ اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے تو اس کی رفتار خاصی تیز ہو گئی۔ اور سوشلسٹ اسٹیٹ یا ویلفیئر اسٹیٹ (فلاحی ریاست) کا قیام تقریباً یورپ کی ہر قوم کا نصب العین بن گیا ہے۔ نیز قرونِ وسطیٰ میں کلیسا اور پوپ کے زیر اثر یورپ کو جو وحدت میسّر تھی اور جسے پارہ پارہ کرنے کا ملزم قومیت کو ٹھہرایا جاتا تھا۔ یورپ پھر اسی وحدت کی طرف بلکہ اس سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر قدم بڑھا رہا ہے۔

یورپ قرونِ وسطیٰ کے ان تصوّرات سے ہم سے بہت پہلے نکل گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں جاگیرداری کے فرسودہ نظام کی جگہ جس کی بنیاد مذہب کے جامد، علیحدگی پسند، رجعت پرست اور فرقہ پرور تصوّرات تھے، قومی و جمہوری نظام نے لے لی۔ یورپ میں ان تصوّرات کی مذہبی مظاہر کلیسائی عدالتیں تھیں، جو اُس زمانے میں عیسائیوں کے عقیدوں کا احتساب کرتیں۔ اور بدعقیدہ عیسائیوں کو زندہ جلاتی تھیں۔ اس کے علاوہ طبیعیات کی دنیا میں آزادانہ تحقیقات کرنے والوں پر کلیسا کے ہاتھوں جو کچھ گزری، وہ ایک الگ داستان ہے۔ اس کے برعکس وہاں قومی و جمہوری نظام، برسرکار آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے سامنے ہمہ جہتی ترقی کے لامحدود امکانات کھل گئے۔ چنانچہ پروفیسر جرمانوس کے الفاظ میں[1]

"ہوا یہ کہ یورپ کی مرکزی حکومت کی جگہ جو قرونِ وسطیٰ میں رائج شدہ مذہبی وحدت کے تصور پر چلتی تھی، یورپی اقوام کی علاقائی وحدتوں نے لے لی ...... اور عوام الناس متوسط طبقے، صنعت کار، تاجر اور عام شہری قوم کی ریڑھ کی ہڈی بن گئے ..... قومیت نے یورپ میں تنظیم کا ایک نیا اساس پیدا کیا اور اس مابعد الطبیعاتی افسانہ کو ختم کر دیا کہ اس زمین میں خدا کی بادشاہت قائم ہونی چاہیئے۔ اس کے برعکس اس کی جگہ زمین پر انسان کی حکومت قائم کرنے کی کوشش ..... قرونِ وسطیٰ میں اجتماعی نظام کا جو تصوّر تھا، اس میں فرائض کی حیثیت رہنما اصول کی تھی۔ اس کے برعکس قومیت نے معاشرے کی بنیاد انسانی قوانین پر رکھی جو قابل تغیّر اور حالات و کوائف کے ساتھ بدلنے والے تھے ..... جہاں قرونِ وسطیٰ کی دینیاتی روح نے نہ ٹلنے والی تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو ہی زندگی کا مقصد بنایا تھا،

---

[1] مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب۔

وہاں قومیت نے انسانی دماغ کے سامنے نئی سے نئی راہیں کھول دیں۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ انسانی مساوات کا دور اِس دنیا میں شروع ہوگا۔ اور ظالم و جابر فرمانرواؤں سے جو اپنے حق میں بزعمِ خود پروانہ خداوندی لئے پھرتے ہیں، یہیں لڑا جا سکتا اور انہیں مٹایا جا سکتا ہے ......."

قومیت کے اس رجحان نے یورپ میں اجتماعی ترقی کی رفتار کو بھی حیرت انگیز طریقے سے تیز کر دیا جس کی وجہ سے وہاں تجارت و صنعت کو بڑا فروغ ہوا۔ اور اس نے استعمار کی شکل میں سارے اسلامی مشرق کو اپنا اقتصادی اور سیاسی غلام بنا لیا۔ یہ سب کچھ انیسویں صدی کے اوائل میں ہوتا ہے۔ اور اس وقت "اسلامی دنیا" مکمل جمود سے نڈھال، یورپ کے قدموں پر گری پڑی تھی۔ اور زہد و تقویٰ میں ڈوبا ہوا مشرق اہل یورپ کی معاشی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن رہا تھا۔"

لیکن اسی زمانے میں یورپ کے اس معاشی اور سیاسی تسلط کا ردّ عمل بھی اسلامی مشرق میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور قرونِ وسطیٰ کی جن فکری و مذہبی اور اجتماعی و سیاسی زنجیروں سے یورپ ہم سے پہلے آزاد ہو کر ہم پر زندگی کے ہر شعبے میں غالب آ گیا تھا ہمارے ہاں بھی ان زنجیروں کو توڑنے کی کوششیں شروع کی جاتی ہیں۔ ان کوششوں کی ایک طویل تاریخ ہے جنہیں یہاں دہرانا ممکن نہیں۔ ترکی میں "تنظیمات" کے دور سے ان کا آغاز ہوا لیکن بدقسمتی سے سلطان عبدالحمید کی مطلق العنانی اور استبداد جسے اس وقت "خلافت" اور "بین الاسلامیات" کا نام دیا گیا، ۳۳ سال تک اس ارتقائی عمل میں حائل رہا۔ مصر میں محمدؐ علی پاشا نے اس کی ابتدا کی اور دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ یہ کوششیں جاری رہیں۔

دنیائے اسلام میں سب سے پہلے محمد علی پاشا مصر میں عہدِ حاضر کی طرز کی قومی حکومت کا اساس رکھنے میں کامیاب ہوا۔ اسے نپولین[1] کی اصلاحات سے، جو اس نے اپنے زمانہ قیامِ مصر میں کی تھیں۔ نیز فرانسیسی ماہرین سے اس کام میں بڑی مدد ملی۔ مصر کی اس قومی حکومت میں شہریت کی شرط وطنیت قرار دی گئی۔ اور ہر مصری کو خواہ وہ مسلمان ہو یا قبطی۔ تاریخ اسلام میں پہلی دفعہ برابر کا شہری مانا گیا۔ اور غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا سوال کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا۔ اس زمانے میں یہ ایک بڑا انقلابی

---

[1] اگلے صفحہ پر

اقدام ثقافت[2]

بعدازاں اس قسم کی قومی حکومتوں کا تصور بتدریج تمام اسلامی دنیا میں پھیلتا گیا۔ اور بالخصوص سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں میں یہ خیال بھی عام ہوا کہ یہ قومی حکومت "مشروطیت" کی پابند ہونی چاہیئے، یعنی یہ حکومت اپنے عوام کے نمائندوں کے سامنے جواب دِہ ہو۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جمہوریت نے بھی اسلامی دنیا میں راہ پالی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ترکی کی سب سے پہلی مسلمان جمہوری مملکت وجود میں آئی۔ اور اب تو اس کے نقشِ قدم پر ایک ایک کر کے سب مسلمان ملک جا رہے ہیں۔

یہ تو نوعیّتِ حکومت کا بنیادی مسئلہ ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس تمام عرصے میں یورپ کے نظم ونسقِ حکومت، اس کے معاشی، تجارتی، صنعتی اور سماجی نظام کو بھی کسی نہ کسی حد تک اپنانے کا عمل دنیائے اسلام میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ یورپ کی فکری، ادبی اور علمی قدریں اور سائنسی اور ٹیکنیکل ایجادات مسلمان اہلِ علم کے لئے مرکزِ توجّہ بن گئیں۔ اس اخذ و استفادہ کے عمل کو (EUROPEANISATION) کا نام دیا گیا ہے۔ اور یورپ کے اوضاع و اطوار کو اس طرح اپنانے کی طرف اسلامی مشرق بلا رکاوٹ جا رہا ہے۔ اور اس معاملے میں ترکی سب سے آگے تھا گویا مسلمانوں کی نئی نئی قومی وجمہوری حکومتوں کے لئے ترکی ایک نمونہ بنی۔

---

[1] مصری قوم پرستی کا پہلا نقیب نپولین تھا۔ جس نے مصر پر حملہ آور ہوتے وقت اپنے ایک جنگی جہاز میں عربی زبان کے چھاپہ خانے سے مصریوں کے نام اس مضمون کا مشہور اعلان طبع کیا تھا، جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ اجنبی مملوک حاکموں کے جوئے غلامی کو اتار پھینکیں۔ نپولین نے وہاں سائنسی ادارے قائم کئے اور مصر کو یورپ کے قریب تر کرنے میں بڑا کام کیا۔ مصر میں عربی ادب نے بھی یورپ کے اثرات کے ماتحت ہی نئی زندگی پائی۔

[2] محمد علی پاشا نے اس بارے میں علمائے ازہر سے استفتاء کیا تھا اور اسی زمانہ کی ضرورتیں اور اپنی مجبوریاں بتا کر ان سے مشورہ مانگا تھا۔ یہاں پوری بحث کی گنجائش نہیں بہر حال علماء نے اس دور میں مصر کے خاص حالات کے پیشِ نظر مذہب کے بجائے وطنیت کو شہریت کا اساس بنانے کی اجازت دے دی یہ ۱۸۳۰ء کے قریب کا زمانہ ہوگا۔